كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿ص : ٢٩﴾

تدبرقرآن

تفسیر سورۃ الفاتحہ

امین احسن اصلاحی

www.facebook.com/payamequran

پیامِ قرآن کی پیش کش

تدبرِ قرآن

تفسیر سورہ الفاتحہ

امین احسن اصلاحی

1-الفاتحه

1.(THE OPENING)

آیات 7| مکیّ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا مضمون

اس سورہ میں پہلے اس جذبہ ءشکر کی تعبیر ہے جو اللہ تعالیٰ کی پروردگاری، اس کی بے پایاں رحمت اور اس کائنات کے نظام میں اس کے قانونِ عدل کے مشاہدات سے ایک سلیم الفطرت انسان پر طاری ہوتا ہے یا طاری ہونا چاہئیے۔ پھر اس جذبہ ءشکر سے خدا ہی کی بندگی اور اسی سے استعانت کا جو جذبہ ابھرتا ہے یا ابھرنا چاہئیے اس کو تعبیر کیا گیا ہے، پھر اس جذبہ کی تحریک سے جو مزید طلب و جستجو ہدایت ور ہنمائی کے لیے یا پیدا ہونی چاہئیے وہ ظاہر کی گئی ہے۔

ب۔ سورہ کا اسلوب

اس سورہ کا اسلوب دعائیہ ہے۔ لیکن اندازِ کلام مخاطب کو سکھانے کا نہیں ہے کہ وہ یوں دعا کرے بلکہ اصل دعا ہماری زبان پر طاری کر دی گئی ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ اگر ہماری فطرت سلیم ہے تو ہماری زبان سے ہمارے دل کا ترانہ ءحمد یوں نکلنا چاہئیے۔ چونکہ یہ تعبیر اسی کی بخشی ہوئی ہے۔ جو ہماری فطرت کا بنانے والا ہے اس وجہ سے اس سے زیادہ سچی تعبیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر سلیم الفطرت انسان اس کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھتا ہے۔ صرف وہی لوگ اس سے کوئی بیگانگی محسوس کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہو۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴿۱﴾

ترجمہ

شروع خدائے رحمان ور حیم کے نام سے

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

۱: اس آیت کی تاریخی حیثیت: قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مضمون بہت قدیم زمانہ سے اہل مذاہب میں نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ فصیح و بلیغ الفاظ تو ممکن ہے پہلی مرتبہ قرآن مجید میں نازل ہوئے ہوں، لیکن جہاں تک اس کے مضمون کا تعلق ہے یہ کسی کام کے آغاز وافتتاح کے لئے اس قدر موزونیت و مناسبت رکھتا ہے کہ دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس کی تعلیم انسان کو بالکل شروع ہی میں دی ہوگی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق خود قرآن مجید میں یہ نقل ہے کہ انہوں نے اپنے باایمان متعلقین اور اپنے ساتھیوں کو جب کشتی میں سوار کرایا تو اس وقت اسی سے ملتے جلتے الفاظ کہے:

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا ۚ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿ہود:۴۱﴾

اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا، بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو جو نامہ لکھا، اس کا آغاز بھی انہی مبارک کلمات سے کیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ﴿نمل:۳۰﴾

یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوا ہے۔

۲- یہ آیت دعا ہے: یہ کلام خبر یہ نہیں ہے بلکہ سورہ فاتحہ کی طرح، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، یہ دعا ہے۔ ایک سلیم الفطرت آدمی کے دل کی یہ ایک فطری صدا ہے جو ہر قابل ذکر کام کرتے وقت اس کی زبان سے نکلنی چاہئے۔ اسی فطری صدا کو وحی الہی نے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے اور ایسا خوبصورت جامہ پہنایا ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورت جامہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی کام کرنے سے پہلے جب یہ دعا ارادہ اور شعور کے ساتھ زبان سے نکلتی ہے تو اول تو پہلے ہی قدم پر انسان کو متنبہ کر دیتی ہے کہ جو کام وہ کرنے جا رہا ہے وہ کام بہر حال خدا کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کی پسند کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہونا چاہئے۔ ثانیاً وہ اس دعا کی برکت سے خدا کی دو عظیم صفتوں، رحمن اور رحیم، کا سہارا حاصل کر لیتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اس بات کی ضمانت ہیں کہ اللہ تعالی اس کام میں اس کو برکت عطا فرمائے، اس کے اختیار کرنے میں اگر اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اس کے وبال سے اس کو محفوظ رکھے، اس کو نباہنے اور تکمیل تک پہنچانے کی اس کو قوت و ہمت دے، شیطان کی چالوں اور فریبوں سے اس کو امان میں رکھے اور دنیا میں بھی اس کام کو اس کے لئے نافع اور بابرکت بنائے اور آخرت میں بھی یہ اس کے لئے رضائے الہی کے حصول کا ذریعہ بنے۔ جو کام اس دعا کے بغیر کیا جاتا ہے وہ ان تمام برکتوں سے خالی ہوتا ہے اس وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کام بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے۔

بسم اللہ کی یہ برکتیں تو ہر کام کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں لیکن خاص قرآن کی تلاوت کے آغاز اس دعا سے کرنے میں کچھ اور پہلو بھی ہیں جو پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

ایک یہ کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سے قرآن مجید کی تلاوت کا آغاز کر کے بندہ اس حکم کی تعمیل کرتا ہے جو اللہ تعالی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بالکل ابتدائی وحی نازل کرتے وقت ہی دیا تھا:

اقرا باسم ربک الذی خلق ۔۔۔(سورہ علق: ۱)

اپنے خداوند کے نام سے پڑھ، جس نے پیدا کیا۔

دوسرا یہ کے یہ مبارک کلمہ اس حقیقت کی یاددہانی کراتا ہے کہ انسان پر اللہ تعالی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اس کو نطق اور گویائی عطا فرمائی جس کی بدولت وہ قرآن کی نعمت کا مستحق بن سکا۔ اس حقیقت کی طرف اللہ تعالی کی صفت رحمان اشارہ کر رہی ہے جس

کا اس آیت میں حوالہ ہے۔ ایک دوسری جگہ یہ بات تصریح کے ساتھ کہی گئی ہے کہ یہ اللہ تعالی کی رحمانیت ہے کہ اس نے انسان کو پیدا کیا، اس کو نطق کی قابلیت عطا فرمائی اور اس کو قرآن کریم کی تعلیم دی۔ فرمایا ہے:

الرَّحْمَٰنُ ﴿١﴾ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ﴿٢﴾ خَلَقَ الْإِنسَانَ ﴿٣﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿٤﴾ ۔۔۔۔ الرحمن

خدائے رحمان نے قرآن سکھایا، اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو گویائی کی تعلیم دی۔۔۔

تیسرا یہ کہ یہ آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید سے متعلق ایک خاص پیشن گوئی کی تصدیق کر رہی ہے جس کی سند پچھلے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ خلقِ خدا کو جو تعلیم دیں گے وہ اللہ کا نام لے کر دیں گے۔ حضرت موسی علیہ السلام کی پانچویں کتاب باب ۱۸ میں یہ الفاظ درج ہیں۔

"میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گے اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔"

چوتھا یہ کہ جس طرح قرآن مجید خدا کی صفت رحمانیت کا مظہر ہے اسی طرح اس کی صفت رحمانیت ہی ہے جو قرآن کے فتح باب کی کلید ہے، اسی سے اس کے بند دروازے کھلیں گے، اسی سے اس کی مشکلات آسان ہوں گی، اس منبع فیض سے قاری پر معانی و حقائق کا فیضان ہو گا اور اسی کے سہارے وہ کجی و گمراہی اور نفس اور شیطان کی آفتوں سے محفوظ رہے گا۔

۳- آیت کے اسمائے حسنہ: اس آیت میں اللہ تعالی کے ناموں میں سے تین کا ذکر آیا ہے۔ اللہ، رحمان، رحیم۔ مختصراً ان کے مفہوم بھی سمجھ لینے چاہئیں۔

اللہ: اللہ کا نام لفظ الہ پر الف لام تعریف داخل کر کے بنا ہے۔ یہ نام ابتدا سے صرف اس خدائے برتر کے لئے خاص رہا ہے جو آسمان و زمین اور تمام مخلوقات کا خالق ہے۔ نزول قرآن سے پہلے عرب جاہلیت میں بھی اس کا یہی مفہوم تھا۔ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود اپنے دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی خدا کے برابر قرار نہیں دیتے تھے ان کو اس بات کا اقرار تھا کہ آسمان و زمین اور تمام مخلوقات کا خالق اللہ تعالی ہی ہے، اسی نے سورج اور چاند بنائے ہیں۔ اسی نے ان کو مسخر کیا ہے اور وہی پانی برسانے والا اور روزی دینے والا ہے۔

دوسرے دیوتاوں کی پرستش وہ محض اس غلط گمان کی بنا پر کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالی کے مقرب ہیں اور اس کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے خیالات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ہم اختصار کے ساتھ یہاں صرف دو تین آیتیں نقل کرتے ہیں:

۔۔۔ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ ۔۔۔﴿٣﴾

ہم نہیں پوجتے ان کو مگر اس لئے کہ یہ اللہ سے ہم کو قریب کر دیں۔۔۔۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٦١﴾ اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٣﴾ ۔ **العنکبوت**

اگر تم ان سے پوچھو کس نے بنایا آسمانوں اور زمین کو اور مسخر کیا سورج اور چاند کو؟ کہیں گے، اللہ نے پھر کہاں ان کی عقل الٹ جاتی ہے۔ اللہ ہی روزی میں وسعت دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور تنگ کر دیتا ہے اس کے لئے۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اور اگر ان سے پوچھو کس نے اتارا بادل سے پانی، پھر زندہ کی اس سے زمین اس کے خشک ہونے کے بعد؟ کہیں گے، اللہ نے ۔۔۔۔۔

اسی طرح تمام قوتوں اور قابلیتوں، تمام زندگی اور موت اور کائنات کے تمام انتظام و انصرام کا حقیقی منبع اور مرکز بھی وہ اللہ تعالی کو ہی مانتے تھے:

قُلْ مَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّن يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَن يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿يونس:٣١﴾

ان سے پوچھو تم کو کون روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے یا کون اختیار رکھتا ہے تمہارے سمع و بصر پر اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور کون سارے معاملے کا انتظام کرتا ہے؟ جواب دیں گے، اللہ، پھر پوچھو تو اس اللہ سے ڈرتے نہیں؟

رحمان اور رحیم: اسم رحمان، غضبان اور شکران کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور اسم رحیم، علیم اور کریم کے وزن پر صفت کا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رحیم کے مقابل میں رحمان میں زیادہ مبالغہ ہے اس وجہ سے رحمان کے بعد رحیم کا لفظ ان کے خیال میں ایک زائد لفظ ہے جس کی چنداں ضرورت تو نہیں تھی لیکن یہ تاکید مزید کے طور پر آ گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے استعمالات کے لحاظ سے فعلان کا وزن جوش و خروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اور فعیل کا وزن دوام و استمرار اور پائیداری واستواری پر۔ اس وجہ سے ان دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت بھی برائے بیت نہیں ہے بلکہ ان میں سے ایک خدا کی رحمت کے جوش و خروش کو ظاہر کر رہی ہے، دوسری اس کے دوام و تسلسل کو۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا خدا کی رحمت اس خلق پر ہے بھی اسی نوعیت سے۔ اس میں جوش ہی جوش نہیں ہے بلکہ پائیداری اور استقلال بھی ہے۔ اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ اپنی رحمانیت کے جوش میں دنیا تو پیدا کر ڈالی ہو لیکن پیدا کر کے پھر اس کی خبر گیری اور نگہداشت سے غافل ہو گیا ہے بلکہ اس کو پیدا کرنے کے بعد وہ اپنی پوری شانِ رحیمیت کے ساتھ اس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرما رہا ہے۔ بندہ جب بھی اسے پکارتا ہے وہ اس کی پکار سنتا ہے اور اس کی دعاوں اور التجاؤں کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے۔ پھر اس کی رحمتیں اسی چند روزہ زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے ان پر اس کی رحمت ایک ایسی ابدی اور لازوال زندگی میں بھی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری حقیقت اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتی جب تک یہ دونوں لفظ مل کر اس کو ظاہر نہ کریں۔

۴- قرآن میں اس آیت کی جگہ: اس آیت سے متعلق ایک اہم سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے ہ قرآن مجید میں اس کی اصل جگہ کہاں ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ یوں تو یہ ہر سورہ کے شروع میں، سوائے سورہ توبہ کے، ایک مستقل آیت کی حیثیت سے لکھی جاتی ہے لیکن کسی سورہ میں بھی، ماسوائے سورہ نمل کے، بظاہر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے یہ شامل نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ کسی خاص سورہ کا حصہ بھی ہے یا ہر سورہ کے اوپر یہ صرف بطور ایک متبرک آغاز اور ایک علامت امتیار کے ثبت ہے۔ مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورہ کی بھی، بشمول سورہ فاتحہ، آیت نہیں ہے بلکہ ہر سورہ کے شروع میں اس کو محض تبرک اور ایک علامت فصل کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اس سے ایک سورہ دوسری سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے کسی سورہ کا افتتاح کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

اس کے بر عکس مکہ اور کوفہ کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورہ فاتحہ کی بھی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کی بھی ایک آیت ہے۔ یہ مذہب امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمتہ اللہ علیہ اس کو سورہ فاتحہ کی ایک آیت اور دوسری سورتوں کے لئے بمنزلہ فاتحہ مانتے ہیں۔ مجھے قوی مذہب قرائے مدینہ کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی رہنمائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی ہے اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے۔ اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورہ فاتحہ اور غیر سورہ فاتحہ میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر سورہ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے۔ اس کی حیثیت سورہ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٢﴾

ترجمہ

شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے، کائنات کا رب۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

حمد: حمد کا ترجمہ عام طور پر قرآن مجید کے مترجموں نے تعریف کیا ہے۔ لیکن میں نے اس کا ترجمہ شکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی یہ لفظ اس ترکیب کے ساتھ استعمال ہوا ہے اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے جس مفہوم کو ہم شکر کے لفظ سے ادا کرتے ہیں مثلاً:

وقالو االحمد للہ الذی حدانا لھذا۔۔(اعراف:43)

انہوں نے کہا شکر کا سزاوار ہے اللہ جس نے ہمیں اس کی ہدایت بخشی۔

واخر دعواھم ان الحمد للہ رب العلمین۔۔ (یونس:10)

اور ان کی آخری صدا یہ ہو گی کہ شکر ہے اللہ کے لئے جو عالم کا رب ہے۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمعیل واسحق۔۔ (ابراھیم:39)

شکر ہے اللہ کے لئے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمعیل اور اسحق عطا فرمائے۔

استعمالات کے لحاظ سے اگرچہ حمد کا لفظ شکر کے مقابل میں زیادہ وسیع ہے، شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو۔ برعکس اس کے حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لئے عام ہے، خواہ ان کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو۔ تاہم شکر کا مفہوم اس لفظ کا جزو غالب ہے۔ اس وجہ سے اس کے ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کرنے کے لئے یا تو تعریف کے لفظ کے ساتھ شکر کا لفظ بھی ملانا ہو گا یا پھر شکر ہی کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا تاکہ یہ سورہ جس احساس شکر اور جس جذبہ سپاس کی تعبیر ہے اس کا پورا پورا اظہار ہو سکے۔ یہ اظہار صرف تعریف کے لفظ سے اچھی طرح نہیں ہوتا۔ آدمی تعریف کسی بھی اچھی چیز کی کر سکتا ہے اگرچہ اس کی اپنی ذات سے اس کا کوئی دور کا بھی واسطہ نہ ہو، لیکن یہ سورہ ہماری فطرت کے جس جوش کا مظہر ہے وہ جوش ابھرا ہی ہے اللہ تعالی کی ربوبیت ورحمانیت کے ان مشاہدات سے جن کا تعلق براہ راست ہمارے ذات سے ہے۔ اگر یہ اچھی طرح واضح نہ ہو سکے تو اس سورہ کی جو اصل روح ہے وہ واضح نہ ہو سکے گی۔ شکر کے لفظ سے سورہ کا یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے۔

اللہ: اس کی وضاحت آیت بسم اللہ کے تحت ہو چکی ہے۔

رب: رب کے معنی پرورش کرنے والے اور مالک و آقا کے آتے ہیں۔ یہ دوسرا مفہوم اگرچہ پہلے مفہوم ہی سے اس کے ایک لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا ہے کیونکہ جو ذات پرورش کرنے والی ہے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مالک اور آقا بنے۔ لیکن یہ مفہوم اس لفظ پر ایسا غالب ہو چکا ہے کہ اس سے الگ ہو کر محض پرورش کرنے کے لئے اس کا استعمال باقی نہیں رہا۔

قرآن مجید کے مخاطب اول کائنات کا خالق تو، جیسا کہ آیت بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکا ہے، تنہا اللہ تعالی ہی کو مانتے ہیں لیکن رب انہوں نے اور بھی بنا رکھے تھے جن کی نسبت ان کا گمان تھا کہ خدا نے کائنات کے انتظام میں ان کو اپنا شریک بنا رکھا ہے، اس وجہ سے یہ عبادت واطاعت کے حقدار ہیں۔ یہاں اللہ کے بعد اس کی پہلی ہی صفت رب العالمین بیان ہوئی جس سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ جو اللہ کائنات کا خالق ہے، وہی اس کا مالک بھی ہے کیونکہ وہی سب کی پرورش کرنے والا ہے۔

الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ﴿٣﴾

ترجمہ

رحمان اور رحیم۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اللہ تعالیٰ کے ان دونوں ناموں کی وضاحت آیت بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٤﴾

ترجمہ

جزا و سزا کے دن کا مالک۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

لفظ دین کے معانی : دین کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

1۔ مذہب و شریعت کے معنی کے لیے مثلاً:

'اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ' (آل عمران:83)

(کیا خدا کے اتارے ہوئے مذہب کے سوا وہ کسی اور مذہب کے طالب ہیں)۔

2۔ قانون ملکی کے لیے مثلاً:

'مَا كَانَ لِيَأْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ' (یوسف :76)

(اس کو بادشاہ کے قانون کی رو سے یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو روک سکے)۔

3۔ اطاعت کے معنی کے لیے مثلاً:

'وَلَه مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا' (نحل :52)

(اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے)۔

4۔ جزا کے معنی کے لیے مثلاً

'اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ' (ذاریات:56)

(جس چیز کی تمھیں دھمکی سنائی جارہی ہے وہ سچ ہے اور جزاو سزا واقع ہو کر رہے گی)

جزا سے مراد اس کے دونوں پہلو ہیں۔ نیک اعمال کا صلہ بھی اور برے کاموں کی سزا بھی۔ اس وجہ سے ہم نے ترجمہ میں جزا کے ساتھ سزا کا لفظ بھی بڑھا دیا ہے۔

جزاو سزا کے دن کا تنہا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس روز سارا زور اور سارا اختیار اسی کو حاصل ہو گا۔ اس کے آگے سب عاجز و سر فگندہ ہوں گے۔ کسی کی مجال نہ ہو گی کہ اس کی اجازت کے بغیر زبان کھول سکے۔ سارے معاملات کا فیصلہ تنہا وہی کرے گا جس کو چاہے گا سزا دے گا، جس کو چاہے گا انعام دے گا۔ جیسا کہ فرمایا ہے

'اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ' (حج :56)

(اس دن سارا اختیار اللہ ہی کو ہو گا، وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا)

'لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ' (غافر :16)

(آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟ صرف خدائے واحد و قہار کی)

اس آیت کے تین لفظوں میں جو بات پوشیدہ ہے وہ اگر پھیلا دی جائے تو پوری بات یوں ہو گی کہ ایک دن جزا اور سزا کا آنے والا ہے۔ اس دن سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہو گا اور اس کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہو گی۔ لیکن کلام کے دعائیہ اسلوب میں یہ بات اس طرح لپیٹ دی گئی ہے کہ دعا کرنے والا ایک ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت سے ان سب باتوں کا اعتراف کر جاتا ہے۔ گویا خدا کی ربوبیت و رحمت اور اس کے عدل و انصاف کے ان آثار و دلائل کے بعد جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں، ایک ہٹ دھرم کے سوا کون ہے، جو اس حقیقت کے کسی جزو کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر سکے ؟

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴿٥﴾

ترجمہ

ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'عبادت' کا مفہوم : عبادت کے اصلی معنی عربی لغت میں انتہائی خضوع اور انتہائی عاجزی و فروتنی کے اظہار کے ہیں۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ اس خضوع و خشوع کی تعبیر کے لیے خاص ہو گیا ہے جو بندہ اپنے خالق و مالک کے لیے ظاہر کرتا ہے۔ پھر اطاعت کا مفہوم بھی اس لفظ کے لوازم میں داخل ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے کہ انسان جس ذات کو اپنے انتہائی خضوع و خشوع کا واحد مستحق سمجھے زندگی کے معاملات میں اس کی اطاعت کو لازم نہ جانے۔ چنانچہ عبادت کی اس حقیقت کو قرآن مجید نے بعض جگہ کھول بھی دیا ہے۔ مثلاً:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ . (2:زمر)

ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ تو اللہ ہی کی بندگی کرو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔

عبادت کے ساتھ اطاعت کا یہ تعلق اس قدر گہرا ہے کہ بعض جگہ یہ لفظ صاف صاف اطاعت کے مفہوم ہی کے لیے استعمال ہو گیا ہے مثلاً:

اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّیۡطٰنَ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ. (60:یٰس)

کہ شیطان کی عبادت نہ کرو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا جو حق بندوں پر ہے اس آیت میں وہ بھی بیان ہو گیا ہے اور بندے کا جو حق خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب کیا ہے وہ بھی اس میں بیان ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حق بندے پر یہ ہے کہ بندہ تنہا اسی کی بندگی کرے اور اسی سے التجا کرے۔ بندے کا حق اس نے اپنے اوپر یہ بتایا ہے کہ وہ اس پر رحمت نازل کرتا ہے اور اس کی مدد فرماتا ہے۔ آیت کے پہلے ٹکڑے میں بندہ اس حق کا اقرار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا اس کے اوپر ہے اور اس کے دوسرے ٹکڑے میں اس حق کے لیے درخواست پیش کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر بندے کی بتایا ہے۔ لیکن پیش کرنے کا انداز نہایت مؤدبانہ ہے۔ بندہ اپنے کسی حق کی طرف کوئی اشارہ کرنے کے بجائے صرف اپنی احتیاج اپنے اعتماد اور اپنی تمنا کا اظہار کر دیتا ہے کیونکہ بندے کا شایان شان یہی ہے کہ وہ اپنے رب سے التجا اور درخواست کرے نہ کہ اس پر اپنا کوئی حق جتائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ بغیر کسی استحقاق کے بندے کو سب کچھ بخشتا ہے اور پھر اس فضل و کرم کو بندہ کا حق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ سے متعلق جو مشہور حدیث قدسی ہے اس میں خاص اس ٹکڑے سے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں کہ جب بندہ 'اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ' کے الفاظ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ٹکڑا میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو وہ دیا جو اس نے مانگا۔

"ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں" کے الفاظ عام ہیں۔ اس وجہ سے یہ طلب مدد خاص عبادت کے معاملہ میں بھی ہو سکتی ہے اور زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی۔ عبادت میں بندہ خدا کی مدد کا محتاج توفیق و رہنمائی اور ثبات و استقامت کے لیے ہوتا ہے کیونکہ عبادت بالخصوص جب کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں خدا کی اطاعت پر بھی مشتمل ہو ایک بڑی ہی آزمائش کی چیز ہے۔ اس میں ایسے سخت مقامات بھی آتے ہیں جہاں بڑے بڑوں کے پائے ثبات بھی ڈگمگا جاتے ہیں۔

اس جملہ میں مفعول کی تقدیم نے حصر کا مضمون بھی پیدا کر دیا ہے۔ یعنی عبادت بھی صرف خدا ہی کی اور استعانت بھی تنہا اسی سے۔ اس حصر نے شرک کے تمام علائق کا یک قلم خاتمہ کر دیا کیونکہ اس اعتراف کے بعد بندہ کے پاس کسی غیر اللہ کو نہ کچھ دینے کو رہا اور نہ اس

سے کچھ مانگنے کی گنجائش باقی رہی۔ اس کے بعد دوسروں سے بندے کے تعلق کی صرف وہی نوعیت جائز رہ گئی ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے ہی قائم کر دی ہو۔

اهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيمَ ﴿٦﴾

ترجمہ

ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت بخش۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'اِهۡدِنَا' کا مطلب صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا رستہ دکھا دے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی ہے کہ اس راستہ کی صحت پر ہمارے دل مطمئن کر دے، اس پر چلنے کا ہمارے اندر ذوق و شوق پیدا کر دے، اس کی مشکلیں ہمارے لیے آسان کر دے اور اس پر چلا دینے کے بعد دوسری پگڈنڈیوں پر بھٹکنے سے ہمیں محفوظ رکھ۔ یہ سارا مضمون یہاں صلہ کو حذف کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔

'الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيمَ' پر الف لام عہد کا ہے۔ اس سے مراد وہ سیدھا رستہ ہے جو بندوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کھولا ہے، جو دین اور دنیا دونوں کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے، جس پر چلنے کی دعوت نبیوں اور رسولوں نے دی ہے، جس پر ہمیشہ خدا کے نیک بندے چلے ہیں، جو قریب تر اور سہل تر ہے، جس کے بعد ادھر ادھر سے گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں نے بہت سی کج پیچ کی راہیں نکال لی ہیں، لیکن وہ بجائے خود قائم ہے اور خدا تک پہنچنے والے ہمیشہ اسی پر چل کر خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسی سیدھے راستے کو حضورؐ نے ایک مرتبہ اس طرح سمجھایا کہ زمین پر ایک سیدھا خط کھینچا، پھر اس کے داہنے بائیں آڑے ترچھے خطوط کھینچ دیے، پھر فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا رستہ ہے اور یہ آڑے ترچھے خطوط پگڈنڈیاں ہیں اور ان میں سے ہر پگڈنڈی کی طرف کوئی نہ کوئی شیطان بلا رہا ہے۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّالِّينَ ﴿٧﴾

ترجمہ

ان لوگوں کے رستے کی جن پر تو نے اپنا فضل فرمایا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ - الآیۃ' : آدمی جس چیز سے جتنا ہی گہرا لگاؤ رکھتا ہے اس کو اسی قدر وضاحت کے ساتھ خود بھی سمجھنا چاہتا ہے اور دوسرے کو بھی سمجھانا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے صرف اتنے ہی پر بس نہیں کیا کہ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش دی بلکہ اس کی پوری وضاحت بھی کر دی ہے اور یہ وضاحت مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ہے۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ رستہ ان لوگوں کا ہو جن پر تیرا انعام ہوا ہے اور منفی پہلو یہ ہے کہ جو نہ تو مغضوب ہوئے ہیں اور نہ گمراہ۔ اس وضاحت کے بعد مدعا اس طرح آئینہ ہو کر سامنے آگیا ہے کہ کسی اشتباہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اس ساری وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے نہیں تھی کہ (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو دعا کا مدعا سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش آنے کا امکان تھا، بلکہ صرف یہ ہے کہ طالب اپنے مطلوب حقیقی کی طلب کے ساتھ ساتھ ان لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار بھی کر رہا ہے جنھوں نے اس محبوب و مطلوب سے منہ موڑا یا اس سے بھٹک گئے نیز اپنے لیے استقامت و استواری کا بھی طلب گار ہے کہ اس رستہ کو پا جانے کے بعد اس پر قائم رہنا نصیب ہو، ان لوگوں کا حشر نہ جن کو یہ رستہ ملنے کو تو ملا لیکن وہ اس کو پا لینے کے بعد یا تو دیدہ و دانستہ اس سے منحرف ہو جانے کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے، یا اپنی بدعت پسندیوں کی وجہ سے اس کو پا کر اس سے محروم ہو گئے۔

اس آیت میں تین گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک منعم علیہم۔ دوسرا مغضوب علیہم۔ تیسرا ضالین۔ مختصراً ان تینوں گروہوں کی خصوصیات بھی معلوم کر لینی چاہییں۔

'اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ' کا مفہوم: 'اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ' میں نعمت سے مقصود دراصل ہدایت و شریعت کی نعمت ہے جس سے انسان دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا رستہ معلوم کرتا ہے۔ فعل انعام یہاں اپنے کامل اور حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد درحقیقت وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے شریعت کی نعمت عطا فرمائی اور انھوں نے دل و جان سے اس کو قبول کیا، اس نعمت کے دیے جانے پر وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار رہے، اس کی خود بھی قدر کی اور دوسروں کو بھی اس کی قدر کرنے پر ابھارا، اس کے تحفظ کے لیے انھوں نے اپنی

قوتیں اور قابلیتیں بھی صرف کیں، مال بھی قربان کیے اور اگر ضرورت پیش آئی تو اس کی راہ میں جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ کہی گئی ہے اس وجہ سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ اشارہ کس گروہ کی طرف ہے لیکن ایک دوسری آیت میں اس انعام یافتہ گروہ کی وضاحت ہوگئی ہے:

فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ. (نساء:69)

”پس یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام فرمایا انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ۔“

’مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ‘ میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح براہ راست نہیں ہے جس طرح انعام کے ذکر میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو سوءِ ادب سے احتراز ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انعام ہمیشہ اور ہر حال میں بندہ پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے، برعکس اس کے خدا کے غضب کا مستحق بندہ اپنے اعمال کے سبب سے خود بنتا ہے۔

مغضوب علیھم سے مراد: ’مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ‘ سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کی نعمت نازل فرمائی لیکن انھوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے نہ صرف یہ کہ اس کو قبول نہیں کیا، بلکہ اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جن لوگوں نے اس کو ان کے سامنے پیش کیا ان کی بیخ کنی اور قتل کے درپے ہوئے جس کی پاداش میں ان پر خدا کا غضب نازل ہوا اور وہ ہلاک کر دیے گئے۔

دوسرے وہ لوگ جنھوں نے قبول تو کیا لیکن دل کی آمادگی کے ساتھ نہیں قبول کیا بلکہ مارے باندھے قبول کیا، پھر بہت جلد شہوات نفس میں پڑ کر انھوں نے اس کے کچھ حصہ کو ضائع کر دیا، کچھ حصہ میں کتربیونت کر کے اس کو اپنی خواہشات کے مطابق بنالیا اور جن لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی یا ان کو صحیح راستہ پر لانا چاہا انھوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ پچھلی امتوں میں اس کی سب سے واضح مثال یہود ہیں۔ چنانچہ ان کے معتوب و مغضوب ہونے کا ذکر قرآن میں تصریح کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً:

مَنۡ لَّعَنَہُ اللّٰہُ وَغَضِبَ عَلَیۡہِ وَجَعَلَ مِنۡہُمُ الۡقِرَدَۃَ وَالۡخَنَازِیۡرَ. (مائدہ:60)

”جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا۔ اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیز بنائے۔“

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ.(بقرہ:61)

”اور ان کے اوپر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ خدا کا غضب لے کر پلٹے۔“

’ضالّین‘ کی حقیقت: ’ضَآلِّيْنَ‘ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں غلو کیا، جنھوں نے اپنے پیغمبر کا رتبہ اتنا بڑھایا کہ اس کو خدا بنا کر رکھ دیا، جو صرف انہی عبادتوں اور طاعتوں پر قانع نہیں ہوئے جو اللہ اور اللہ کے رسول نے مقرر کی تھیں بلکہ اپنے جی سے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا، جنھوں نے اپنے اگلوں کی ایجاد کی ہوئی بدعتوں اور گمراہیوں کی آنکھ بند کر کے پیروی کی اور اس طرح صراط مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ پچھلی امتوں میں سے اس کی نہایت واضح مثال نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے انہی وجوہ کی بنا پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ان کو گمراہ اور گمراہ کرنے والے قرار دیا ہے۔ مثلاً:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ. (مائدہ:77)

”کہہ دو اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں (بدعتوں) کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ چلے آرہے ہیں اور جنھوں نے بہتوں کو خدا کے رستہ سے بھٹکایا اور جو خود بھی اس کے رستہ سے بھٹکے۔“

سورہ کا استدلالی پہلو

توحید اور آخرت کے دلائل: یہ سورہ چونکہ دعا کے اسلوب میں ہے اس وجہ سے اس میں استدلال کا پہلو واضح نہیں ہے لیکن اس میں جن باتوں کا بندے کی طرف سے اقرار اور پھر جس بات کی درخواست ہے، ان میں سے ہر چیز نہایت مضبوط عقلی اور فطری دلائل پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک دعا تو ہماری زبان سے کہلا دی گئی ہو، جس کے اندر ہماری طرف سے نہایت اہم اعترافات بھی ہوں لیکن نہ تو ان اعترافات ہی کے لیے کوئی عقلی بنیاد ہو اور نہ اس درخواست ہی کے لیے۔

اس دعا کے اندر استدلال کے جو پہلو ہیں، یہاں ہم اختصار سے ان کو واضح کرتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلے اس امر کا اقرار ہے کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس اقرار کی بنیاد خدا کی پروردگاری، اس کی رحمانیت ،اس کی رحیمیت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ پر ہے جو ہمارے اندر بھی موجود ہیں اور اس کائنات کے بھی ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کا بچہ ہو یا کسی حقیر سے حقیر حیوان کا، وہ ابھی اس دنیا میں قدم بھی نہیں رکھتا ہے کہ اس کی پرورش کا سامان پہلے سے بالکل تیار موجود ہوتا ہے۔ اس سامانِ پرورش کی تیاری کا یہ عالم یہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر رات دن اسی کی فراہمی اور اسی کے اہتمام میں سرگرم ہیں۔ سورج بھی اسی کے لیے سرگرم ہے، چاند بھی اسی کے لیے مصروفِ کار ہے، ابر بھی اسی کے لیے اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے اور ہوا بھی ہر آن اسی کے لیے گردش میں ہے۔

پھر پرورش اور تربیت کا یہ اہتمام ہماری زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ میں نہیں پایا جارہا ہے، بلکہ غور کیجئے تو نظر آئے گا کہ یہ زندگی کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے، ہمارا باطن بھی زیرِ تربیت ہے، ہمارا جسم بھی پل رہا ہے، ہماری عقل کو بھی غذا مل رہی ہے، ہماری جسمانی قوتیں اور قابلیتیں بھی پروان چڑھ رہی ہیں اور ہماری روحانی صلاحیتوں کا بھی بالیدگی حاصل ہو رہی ہے۔ غرض ہماری زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نظر انداز ہو رہا ہو۔

اس تمام اہتمام و انتظام کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے؟ کیا وہ اپنی سلطنت کے قیام و بقا کے لیے ہمارا محتاج ہے کہ وہ اس فیاضی کے ساتھ ہمارے اوپر خرچ کرے؟ کیا جس طرح بھیڑوں کے کسی گلّے کا مالک یہ چاہتا ہے کہ اس کی بھیڑیں فربہ رہیں تاکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ نفع کما سکے اسی طرح کی کوئی ذاتی غرض اس جہان کے رب کے سامنے بھی ہے جس کے لیے وہ ہمیں کھلا پلا اور ہماری دیکھ بھال کر رہا ہو؟

انسان جب ان سوالوں پر غور کرتا ہے تو اسے صاف نظر آتا ہے کہ اس طرح کی کسی غرض کوئی ادنیٰ شائبہ یہاں دور دور تک فرض بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جس ذات کی قدرت و حکمت کا ادنیٰ کرشمہ یہ آسمان و زمین ہیں وہ بھلا ہم جیسے حقیر بھنگوں کی کیا محتاج ہو سکتی ہے؟ اچھا، اگر یہ نہیں ہے تو کیا اس کائنات کے خالق و مالک پر ہمارا کوئی حق ہے، جو پہلے سے قائم ہے اور جس کے سبب وہ مجبور ہے کہ ہمارے لیے یہ کچھ اہتمام

کرے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی چیز بھی فرض نہیں کی جاسکتی۔ جن کو وجود کی نعمت ملی ہی محض اس کے لطف و کرم سے ہو وہ بھلا اس پر اپنا کوئی حق قائم کرنے کے قابل کس طرح ہوسکتے ہیں؟ اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے اور صاف ظاہر ہے کہ نہیں ہے تو اس کی اس تمام پروردگاری کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ رحمان اور رحیم ہے۔ یہ اس کی رحمانیت کا جوش ہے کہ اس نے ہم کو وجود بخشا اور یہ اس کی رحیمیت کا فیض ہے کہ وہ برابر ہماری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

انسان جب خدا کی پروردگاری کے اس اہتمام کو دیکھتا ہے تو یہیں سے اس پر علم و معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کا دروازہ ہے۔ جس دن تنہا وہی پورے اختیار کے ساتھ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا، اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانیوں کی انصاف کے ساتھ سزا دے گا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا فضل و رحمت کے ساتھ صلہ دے گا۔

خدا کی پروردگاری اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی نشانیاں ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کس طرح لازم کرتی ہیں؟ اس سوال کا جواب تھوڑی سی وضاحت کا طالب ہے۔

خدا کی پروردگاری سے روزِ جزا پر استدلال قرآن مجید نے جگہ جگہ اس طرح کیا ہے کہ جس خدا نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور آسمان کا شامیانہ تانا، جس نے تمہارے لیے سورج اور چاند چمکائے، جس نے ابر و ہوا جیسی چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگایا، جس نے تمہارے تمام ظاہری اور باطنی، روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا، کیا اس خدا کے متعلق تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمہیں یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یونہی چھوڑ دے گا، یہ تمام کارخانہ محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی غایت و مقصد نہیں ہے؟ تم ایک شترِ بے مہار کی طرح اس سرسبز و شاداب چراگاہ میں بس یونہی چرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہو، نہ تم پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ تم سے کوئی پرسش ہوگی؟ اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے تو نہایت غلط سمجھ رکھا ہے۔ پرورش کا یہ سارا اہتمام پکار پکار کر شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کے لیے ہے اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عائد کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کی بابت ایک ایک شخص سے پرسش ہوگی اور وہی دن فیصلہ کا ہوگا۔ جنھوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہوں گی وہ سرخ رو اور فائز المرام ہوں گے اور جنھوں نے ان کو نظر انداز کیا ہوگا وہ ذلیل و نامراد ہوں گے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے لیکن اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ﴿۶﴾ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ﴿۷﴾ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ﴿۸﴾ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿۹﴾ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ﴿۱۰﴾ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ﴿۱۲﴾ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ﴿۱۳﴾ وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ﴿۱۶﴾ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ﴿۱۷﴾

(النبإ:17-6)

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟ تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا؟ تمہاری نیند کو دافع کلفت نہیں بنایا؟ رات کو تمہارے لیے پردہ نہیں بنایا؟ اور دن کو وقت معاش نہیں بنایا؟ تمہارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے؟ اور اس کے اندر ایک روشن چراغ نہیں رکھا؟ اور کیا ہم نے پانی سے لبریز بدلیوں سے موسلا دھار پانی نہیں برسایا؟ کہ اس کے ذریعہ سے اگائیں غلہ اور نباتات اور گھنے باغ؟ بے شک فیصلہ کے دن کا وقت مقرر ہے!

"بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔" یعنی اوپر جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ سب کچھ اہتمام انسان کے لیے کیا ہے وہ انسانوں کو یوں ہی شتر بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلہ کے لیے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار دیا ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اچھوں اور بروں کے درمیان انصاف کرے، نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے اور بدکاروں کو ان کی برائیوں کی سزا دے۔ ایک رحمان اور رحیم ہستی کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم، نیکوکار اور بد، باغی اور وفادار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے، ان کے درمیان ان کے اعمال کی بنا پر کوئی فرق نہ کرے۔ نہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دے، نہ مظلوم کی مظلومیت کا ظالم سے انتقام لے۔ اگر یہ زندگی کا کارخانہ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد جزا و سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن نہیں آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ کہ العیاذ باللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں بلکہ مجرم نسبتاً اچھے ہیں جن کو جرم اور فساد برپا کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ یہ چیز بداہتہً غلط اور اس کے رحمان و رحیم ہونے کے بالکل منافی ہے۔ چنانچہ اس نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی تردید فرمائی۔ مثلاً:

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۳۶﴾ (سورہ القلم)

کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو!

اور اپنے رحمان ورحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ بتایا ہے کہ ایک دن وہ سب کو جمع کرکے انصاف کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۔ (انعام: 12)

اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف جس میں ذرا شبہ نہیں۔

اس آیت سے واضح ہے کہ قیامت دراصل خدا کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے وہ فیصلہ کا ایک دن ضرور لائے گا جس میں سب کو اکٹھا کر کے ان کے درمیان انصاف فرمائے گا۔ اور یہ بھی اس کی اس رحمت ہی کا تقاضہ ہے کہ اس دن کسی کی مجال نہ ہوگی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی مداخلت کر سکے اور اپنی سفارشوں سے حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکے بلکہ ہر ایک کے لیے بالکل بے لاگ اور پورا انصاف ہو گا۔

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ عدل اور رحمت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ عدل عین رحمت ہی کا تقاضہ ہے۔

جذبہ ءشکر دین کی بنیاد ہے: ربوبیت، رحمت اور عدل کی ان نشانیوں کے مشاہدہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کا جو بے پایاں جذبہ پیدا ہوتا ہے یہی جذبہ ہے جو بندہ کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرے اور اپنی ہر مشکل میں اسی سے مدد مانگے۔ غور کیجئے تو بالکل واضح ہو گا کہ جس طرح یہ جذبہ رحمت وربوبیت کی نشانیوں کا ایک فطری نتیجہ ہے اسی طرح اس جذبہ سے سرشار ہو کر بندہ کا خدا کی طرف اس کی عبادت کے لیے بڑھنا بھی اس جذبہ کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ انسان کا ہر جذبہ اپنا ایک قدرتی ردِ عمل رکھتا ہے۔ اس جذبہ کا، جو اپنے منعمِ حقیقی کی شکر گزاری کے لیے انسان کے اندر ابھرتا ہے، قدرتی ردِ عمل یہ ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے مدد مانگے۔ جو ذات اس فیاضی اور اس اہتمام کے ساتھ پرورش کر رہی ہے، جس کی یہ پروردگاری نہ اس کی کسی غرض پر مبنی ہے اور نہ ہماری طرف سے کسی استحقاق پر بلکہ تمام تر اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا فیضانِ عام ہے، پھر جس کی ربوبیت اور رحمانیت صرف اسی حیاتِ چند روزہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس زندگی کے بعد بھی اپنے نیک بندوں کے لیے اس نے ابدی زندگی کی مسرتیں محفوظ کر رکھی

ہیں، اس کے سوا کون ہے جو انسان کی حقیقی شکر گزاری کا مستحق ہو سکے۔ اور اگر وہی ہمارے حقیقی شکر کا سزاوار ہے تو پھر اس کے سوا کون ہے جو اس بات کا حق دار ہو سکتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس سے مدد مانگیں؟

اس طرح شکر کا جذبہ گویا دھکیل کر بندے کو اس کے منعمِ حقیقی کے دروازے پر ڈال دیتا ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے اور اسی سے طالبِ مدد ہو۔ اس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ در حقیقت شکر کے جذبہ سے بندہ کے اندر خدا کی عبادت کا داعیہ ابھرتا ہے اور پھر اسی جذبہ اور اسی کے قدرتی ردِ عمل سے دین کی داغ بیل پڑتی ہے۔

اس کائنات میں اور خود اپنے وجود کے اندر خدا کی ربوبیت اور اس کی رحمت کے بے شمار آثار دیکھ کر انسان کے اندر اپنے منعمِ حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ اور اس جذبہ کی تحریک سے انسان کے اندر اس کی عبادت کرنے کا ولولہ پیدا ہونا ایک ایسی بات ہے جو ہر پہلو سے بالکل ایک فطری اور بدیہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت کا انکار کر سکے۔

جذبہء خوف کو دین کی بنیاد قرار دینے کی لغویت: لیکن مذہب دشمنی کے اندھے جوش میں فلسفہء جدید کے مدعیوں نے دین کے آغاز سے متعلق اس سے بالکل مختلف نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سب سے قدیم اور ابتدائی جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ان ہولناک اور خوفناک حوادث کے مشاہدہ سے پیدا ہوا جو اس دنیا طوفانوں، زلزلوں اور وباؤں کی صورت میں آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس خوف کے جذبہ نے انسان کو اِن اَن دیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا جن کو اس نے ان حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا۔ اور اس طرح انسان نے شرک سے دین کا آغاز کیا۔

ہم اس غلط نظریہ کی تردید اپنی ایک دوسری کتاب (حقیقتِ شرک و توحید، حصہ دوم) میں پوری تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم صرف اس بات پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ مذہب کے آغاز سے متعلق قرآن کی یہ تقریر زیادہ دل نشین اور عقل و فطرت کے مطابق ہے یا فلسفہء جدید کا یہ نظریہ زیادہ قرینِ عقل و فطرت ہے؟ اس دنیا کے عام واقعات زلزلے، طوفان اور سیلاب ہی ہیں یا اس میں بہاریں بھی آتی ہیں، چاندنی بھی پھیلتی ہے، بارشیں بھی ہوتی ہیں، تارے بھی چمکتے ہیں، پھول بھی کھلتے ہیں اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔ ہمارے عام مشاہدے میں زیادہ تر ربوبیت کی یہ برکتیں اور رحمت کی یہ شانیں آتی رہتی ہیں یا صرف زلزلوں اور طوفانوں کی ہولناکیاں ہی آتی ہیں؟ اس کائنات اور خود اپنی فطرت کے عجائب پر نگاہ ڈالنے کے بعد انسان پر ان دیکھی طاقتوں کا ہول طاری ہوتا ہے یا ایک رحمان و رحیم اور منعم و دیّان خدا کے احسانات کے احساس سے دل کا ریشہ ریشہ لبریز ہو جاتا ہے؟ جو شخص بھی ان سوالوں پر ضد اور

ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر غور کرے گا اور بے کم و کاست اپنے سچے تاثر کا اظہار کرے گا، وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی عقل اور انسانی فطرت کے بہاؤ کا اصلی رخ وہی ہے جس کا پتہ قرآن مجید دے رہا ہے، نہ کہ وہ جس کی طرف فلسفہ ءجدید لے کر جا رہا ہے۔

یہ نظریہ بھی بدیہی طور پر غلط معلوم ہوتا ہے کہ خوف کا جذبہ تمام دوسرے جذبات سے مقدم ہے۔ خوف کا تجزیہ کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ خوف نام ہے اس چیز کا کہ آپ کو کسی ایسی چیز کے چھن جانے یا اس سے محروم ہو جانے کا اندیشہ یا خطرہ پیدا ہو گیا ہو جو آپ کو حاصل بھی ہے اور جو عزیز بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک منعم کا شعور لازمی ہوا اور پھر اس کی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔ انسان کے مشاہدہء کائنات اور مشاہدہءانفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ نعمتوں اور رحمتوں کے مشاہدہ سے اس پر ایک منعمِ حقیقی کی شکر گزاری کا جذبہ اور احساس طاری ہوا ہو اور پھر اس جذبہ کی تحریک سے وہ اس بندگی کی طرف مائل ہوا۔ رہا یہ سوال کہ اس صحیح شاہراہ پر ایک دفعہ پڑ جانے کے بعد وہ دوسری غلط راہوں کی طرف کس طرح مڑ گیا تو اس کا سبب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس کی فطرت میں کوئی خرابی موجود تھی جو اس گمراہی کا سبب بنی، بلکہ اس میں یا تو اختیار و ارادہ کے سوءِ استعمال کو دخل ہے یا عقل کی کج روی اور ہوا پرستی کو۔

اقرارِ بندگی اور اظہارِ اعتماد و توکل کے اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد اھدنا الصّراط المستقیم کی دعا ہمارے سامنے آتی ہے اور اسی دعا پر جو اس تمام تمہید کے بعد اصلی حرفِ مدّعا کی حیثیت رکھتی ہے، یہ سورہ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد مغضوبوں اور گمراہوں کی روش سے اظہارِ بیزاری کا جو مضمون ہے وہ منفی پہلو سے اس دعا کی توضیحِ مزید ہے۔



رسالت کی ضرورت پر ایک دلیل

اوپر کی ساری تمہید کا اقرار واعتراف کی شکل میں نمایاں ہونا اور اھدنا الصّراط المستقیم کا دعا کی شکل میں آنا ایک خاص حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کا تعلق ہے، جہاں تک ان نشانیوں کے مشاہدہ سے شکر کے جذبہ کے ابھرنے کا تعلق ہے اور پھر اس جذبہ ٔ شکر کی تحریک سے جہاں تک اسی منعمِ حقیقی کی بندگی اور اسی سے طلبِ اعانت کے ارادہ کا تعلق ہے، یہ باتیں ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ ہر انسان ان کو محسوس کر سکتا ہے بشر طیکہ اس کے دل پر پردہ نہ پڑا ہوا ہو۔ اگر انسان اپنی عقل اور اپنی فطرت کو ان کی اپنی روش پر کام کرنے دے، غیر فطری اڑنگے ان کی راہ میں نہ ڈالے تو وہ ان باتوں میں سے کسی بات کے اقرار واعتراف میں بھی بخل نہیں کرے گا، یہاں تک کہ ایک روزِ جزا کی آمد میں بھی اس کو شبہ نہیں ہو گا۔ البتہ اگر وہ رکے گا تو اس مقام پر آکر رکے گا کہ جس خدا کی وہ بندگی کرنا چاہتا ہے اور اپنی ہر مشکل میں جس کی مدد پر اس نے بھروسہ کیا ہے اس تک پہنچنے کا، اس کی عبادت کرنے کا ،اس کی پسند ناپسند معلوم کرنے کا اور زندگی کی ہر مشکل میں اس سے مدد مانگنے کا صحیح طریقہ اور اور سیدھا راستہ کیا ہے؟ اسی صحیح راستے کو معلوم کرنے کے لیے بندہ اللہ تعالیٰ سے اھدنا الصّراط المستقیم کی دعا کرتا ہے۔

اس بات کو صریح دعا کے اسلوب میں کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہاں انسان کی اپنی عقل اور سمجھ بالکل عاجز ہے۔ صرف خدا ہی ہے جو بتا سکتا ہے کہ صراطِ مستقیم کیا ہے اور وہی ہے جو اس صراطِ مستقیم کو اختیار کر لینے کے بعد اس پر جمے رہنے کی توفیق بخش سکتا ہے۔ یہیں سے انسانی فطرت کے اندر وہ خلا نمایاں ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ نبوت اور رسالت کا محتاج ہوا ہے۔ انسان اگر کج فہمی سے کام نہ لے تو آفاق اور انفس کی نشانیوں سے وہ یہ تو معلوم کر سکتا ہے کہ خدا ہے، وہ پرورش کرنے والا اور مہربان ہے اور وہ جزا اور سزا دینے والا بھی ہے، لیکن یہ معلوم کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے کہ اس خدا کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ کیا ہے۔ یہی طریقہ بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا ہے۔

سورہ پر دعا کے پہلو سے ایک نظر

دعا کے پہلو سے اس سورہ کی جو اہمیت ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ یہ سورہ ہماری سب سے بڑی عبادت --- نماز --- کی خاص سورہ ہے۔ صحیحین کی مشہور روایت ہے کہ:

لا صلوۃ لم یقرء بفاتحته الکتاب۔

اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔

سورہ کی تاثیر: پھر اپنی تاثیر کے لحاظ سے اس کا جو درجہ ہے اس کا اندازہ اس حدیثِ قدسی سے ہوتا ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ جب پورے شعور اور اخلاص کے ساتھ نماز میں اس سورہ کی تلاوت کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے ساتھ ہی خدا کے ہاں شرفِ قبولیت پاتا ہے۔ حدیث ملاحظہ ہو:

عن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه وسلم قال من صلى صلاة لم يقرأ فيها بأم القرآن فهي خداج ثلاثا غير تمام فقيل لأبي هريرة إنا نكون ورا الإمام فقال اقرأ بها في نفسك فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول قال الله تعالى قسمت الصلاة بيني وبين عبدي نصفين ولعبدي ما سأل فإذا قال العبد الحمد لله رب العالمين قال الله تعالى حمدني عبدي وإذا قال الرحمن الرحيم قال الله تعالى أثنى علي عبدي وإذا قال مالک يوم الدين قال مجدني عبدي وقال مرة فوض إلي عبدي فإذا قال إياک نعبد وإياک نستعين قال هذا بيني وبين عبدي ولعبدي ما سأل فإذا قال اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين أنعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين قال هذا لعبدي ولعبدي ما سأل قال سفيان حدثني به العلا بن عبد الرحمن بن يعقوب دخلت عليه وهو مريض في بيته فسألته أنا عنه

(صحیح مسلم: کتاب الصلوۃ)

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے نماز ادا کی اور اس میں ام القرآن نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ یہی فرمایا اور ناتمام ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا گیا ہے ہم بعض اوقات امام کے پیچھے ہوتے ہیں تو آپ نے فرمایا فاتحہ کو دل میں پڑھو کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ نماز یعنی سورت فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ مانگے جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے میری حمد بیان کی اور جب وہ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف بیان کی اور جب وہ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور ایک بار فرماتا ہے میرے بندے نے اپنے سب کام میرے سپرد کر دیئے اور جب وہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے مانگا ہے جب وہ (اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ) کہتا ہے تو اللہ عزوجل فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے مانگا۔

اس حدیث میں اس سورہ کا جو حقیقت افروز اور معنی خیز تجزیہ ہے، وہ بجائے خود اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے اس پہلو پر ہم غور کرنا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کیا چیز ہے جس نے اس کے لفظ لفظ کے اندر یہ تاثیر بھر دی ہے کہ بندے کی زبان سے ابھی لفظ نکلا نہیں کہ بارگاہِ رب العزت سے اس کی سندِ قبولیت اس کو عطا ہو گئی۔ دعائیں اور بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہیں لیکن شاید ہی کسی دعا کے متعلق اس تفصیل سے بتایا گیا ہو کہ اس کے ایک ایک لفظ کا خود اس ذات پر کیا اثر پڑتا ہے جس سے دعا کی جاتی ہے اور کن لفظوں میں وہ اس کو قبول فرماتا ہے۔

دعا کی خوبیاں: اس دعا کی اس غیر معمولی اہمیت اور عظمت کے سبب سے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی بعض خوبیاں ہم یہاں واضح کریں، اگرچہ توقع نہیں کہ اس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا عشر عشیر بھی ہم بیان کرنے پر قادر ہو سکیں۔

اس دعا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جس چیز کے لیے دعا کی گئی ہے اس سے اعلیٰ اور اس برتر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں بندہ خدا سے خود اسی تک پہنچنے اور اسی کو پانے کے سیدھے راستہ کی ہدایت مانگتا ہے۔ یہ دعا اول تو ہر شائبہ نفس سے پاک ہے- ثانیاً

یہ عین اس مقصد کے لیے دعا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ثالثاً یہ ایک ایسے معاملے میں خدا سے رہنمائی کی دعا ہے جس میں انسان کی اپنی عقل، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، بالکل عاجز و درماندہ ہے۔ صرف خدا ہی کی رہنمائی سے وہ اسے پا بھی سکتا ہے اور اسی کی توفیق سے اسے پا کر اس پر قائم بھی رہ سکتا ہے۔ ان وجوہ سے جب بندہ یہ چیز اپنے رب سے مانگتا ہے تو ایسی چیز مانگتا ہے جو فی الحقیقت مانگنے کی بھی ہے اور تنہا اسی سے مانگنے کی ہے۔

دوسری چیز اس دعا کی تمہید ہے جو ہر پہلو سے ایک ایسی تمہید ہے جس سے بہتر تمہید کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کریم کے دروازے سے سائل کو سب کچھ مل سکتا ہے بشرطیکہ مانگنے کا طریقہ صحیح ہو۔ اس تمہید کے بعض پہلوؤں پر نگاہ ڈال لیجیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا آغاز اعترافِ شکر سے ہوا ہے۔ شکر کا حقیقی سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ٹھہرایا گیا ہے اور یہ شکر ہی وہ چیز ہے جس سے بندہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق قرار پاتا ہے اور جتنا ہی اس میں ترقی کرتا جاتا ہے اسی حساب سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

نِّعۡمَةً مِّنۡ عِندِنَاۚ كَذَٰلِكَ نَجۡزِي مَن شَكَرَ ﴿قمر:۳۵﴾

یہ ہماری طرف سے فضل ہوا اور ایسا ہی ہم بدلہ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو ہمارے شکر گزار رہتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

--- لَئِن شَكَرۡتُمۡ لَأَزِيدَنَّكُمۡ --- ﴿ابراہیم:۷﴾

اگر تم میرے شکر گزار رہو گے تو میں تمہارے لیے اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا رہوں گا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جن صفتوں کے توسّل سے یہ دعا کی گئی ہے، وہ دوسری تمام صفات کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ اس وجہ سے اس دعا میں گویا اللہ تعالیٰ کے سارے ہی اسمائے حسنیٰ کا سہارا حاصل کر لیا گیا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ایّاک نعبدو و ایّاک نستعین میں کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا اظہار ہے۔ بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے دروازے پر ڈال دیتا ہے۔ اس دروازے کے سوا اس کے لیے اور کوئی دروازہ نہیں۔ بس ایک ہی ہے جس کی وہ بندگی کرتا ہے اور ایک

ہی ہے جس سے وہ مدد کی درخواست کرتا ہے۔ جب اس طرح ساری دنیا سے کٹ کر بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دے گا تو آخر اس کی دعا کا ایک ایک حرف کیوں نہ شرفِ قبولیت پائے گا۔

اس دعا کے خاتمہ پر بھی غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ وہ بھی اس کی قبولیت کے لیے ایک بہترین سفارش فراہم کرتا ہے۔ یہاں جس صراطِ مستقیم کی ہدایت کی دعا کی گئی ہے، اول تو اس کے لیے جو اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے وہی اس مطلوب کے لیے بندے کے ذوق و شوق کا پورا پورا اظہار کر رہا ہے کیونکہ اِھدِنَا کا مفہوم، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، صرف اسی قدر نہیں ہے کہ ہمیں سیدھا رستہ بتا دے ۔بلکہ یہ بات بھی اس اسلوب میں چھپی ہوئی ہے کہ اس رستے کے لیے ہماری آنکھیں کھول دے، اس پر چلنے کا ہمیں شوق اور ولولہ عطا فرما، ہمارے دلوں میں اس کی محبت جاں گزیں کر دے اور اسی پر ہمیں جینے کی توفیق دے اور اسی پر مرنے کی سعادت نصیب کر۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت ایسے الفاظ سے کی گئی ہے جن سے ان لوگوں کے ساتھ بندے کی محبت کا اظہار ہوتا ہے جو اسی رستے پہ جئے اور مرے ہیں اور ان لوگوں سے انتہائی بیزاری کا اظہار ہے جنہوں نے شرارت یا حماقت کے سبب سے اس سے انحراف کیا ہے۔

اس دعا کی بے شمار بلاغتوں میں سے یہ چند ہیں جن کی طرف اجمالی طور پر ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اس سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دعا نماز کی مخصوص دعا کیوں قرار دی گئی۔ اور کیوں یہ بات ہے کہ زبان سے نکلتے ہی اس کا لفظ لفظ شرفِ قبولیت حاصل کرتا ہے۔ ایک طرف دعا کے ان الفاظ کو سامنے رکھیے اور دوسری طرف نماز کی مخصوص ہیت اور اس کے مخصوص آداب کو ملحوظ رکھیے، پھر تصور کیجئے کہ کتنی بہترین دعا ہے اور اس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کتنا بہترین طریقہ ہمیں سکھایا ہے۔

سورہ پر دیباچہء قرآن ہونے کی حیثیت سے ایک نظر

قرآنی مطالعہ کے تین بنیادی عنوان: اس سورہ کو قرآن مجید کی ترتیب میں بھی دیباچہء قرآن کی جگہ دی گئی ہے اور حدیثوں میں بھی اس کے جو مختلف نام آئے ہیں ان سے بھی اس کی یہی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً اس کو فاتحہ الکتاب کہا گیا ہے، جس کے صاف معنی دیباچہء قرآن کے ہیں۔ اسی طرح اس کے لیے ام الکتاب یعنی مغزِ قرآن کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، جو پہلے لفظ سے بھی زیادہ اس کی

اہمیت کو واضح کرنے والا ہے۔ کافیہ اور موقّیہ بھی اس کے نام ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورہ اپنے اندر تمام قرآنی مطالب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ مختصراً ہم سورہ کے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک تین وجوہ سے اس سورہ کو دیباچہ ء قرآن ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سورہ میں دین اور شریعت کے نقطہ ء آغاز کا پتہ دیا گیا ہے۔ یہ سورہ ہمیں بتاتی ہے کہ خدا پرستی کا اولین محرک کیا ہے۔ یہ محرک کن عوامل کا نتیجہ ہے۔ اس تحریک سے انسان خدا پرستی کی راہ میں پہلا قدم کیا اٹھاتا ہے اور اس قدم کے بعد اس کے اندر اصل طلب و جستجو کس چیز کے لیے پیدا ہوتی ہے۔

ہر شخص یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ جس سورہ میں مذکورہ سوالوں کا جواب دیا گیا ہو، وہی سورہ اپنے مضمون کے لحاظ سے دیباچہ ء قرآن کی جگہ پانے کے لیے موزوں ترین سورہ ہے۔

اب آیئے ان اشارات کی روشنی میں، جو اوپر گزر چکے ہیں، یہ دیکھیے کہ یہ سورہ ان سوالوں کے کیا جواب دیتی ہے۔

یہ سورہ بتاتی ہے کہ آفاق اور انفس کے اندر خدا کی ربوبیت، اس کی رحمانیت اور رحیمیت اور اس کے عدل کی جو نشانیاں موجود ہیں، وہ انسان کے اندر خدا کے شکر کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ یہ جذبہ ایک زور دار محرک بن کر انسان کو خدا کی عبادت اور اسی سے استعانت کے لیے اکساتا ہے۔ اس کے بعد انسان میں اس سیدھے راستے کی طلب و جستجو پیدا ہوتی ہے جو اس کو خدا تک پہنچائے۔ انسان کی اس طلب و جستجو کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کا نظام قائم فرمایا اور اپنی ہدایت و شریعت نازل فرمائی۔ مذہب کی راہ میں انسان کا فطری ارتقاء اسی طرح ہوا ہے اور اس سورہ میں یہ حقیقت چونکہ نہایت اجمال اور نہایت خوبی کے ساتھ بیان ہوئی ہے، اس وجہ سے اس کو دیباچہ ء قرآن کی جگہ ملی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں اگر ان کو سمیٹا جائے تو وہ تین عنوانوں کے تحت جمع کیے جا سکتے ہیں۔ توحید، قیامت، رسالت۔ یہ سورہ ان تینوں عنوانوں پر بنیادی رہنمائی دیتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے گویا قرآن کے تمام علوم کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اس کی ابتدائی دو آیتوں میں خدا کا ہی تمام عالم کا مالک اور آقا ہونا اور تمام حمد و شکر کا سزاوار ہونا بیان ہوا ہے۔ اس کی تیسری آیت میں ایک روزِ جزا و سزا کی آمد کی طرف بھی اشارہ ہے اور ساتھ ہی اس میں توحید کا مضمون بھی شامل ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا بھی کوئی زور اور اختیار نہیں چلے گا۔ اس کی چوتھی آیت میں بندہ اپنے آپ کو بالکل اپنے رب کے حوالے کر دیتا ہے

اور یہی توحید کی اصلی حقیقت ہے۔ پانچویں آیت میں اصل دعا ہے اور اس دعا ہی سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی سیدھی راہ معلوم کرنے کے لیے نبوت و رسالت کے سلسلہ اور اس کی نازل کردہ ہدایت و شریعت کا محتاج ہے۔ نیز اسی لپیٹ میں یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ خدائی شریعت پانے کے بعد کسی قوم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور اس کی قدر کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کیا معاملہ کرتا ہے۔ غرض اس سورہ کے اندر دین کے تمام بنیادی عناصر جمع ہیں۔ اگر ان کی تفصیل کر دی جائے تو دین کا پورا نظام کھڑا ہو جائے۔ گویا ان چند آیتوں کے اندر پورا قرآنِ عظیم بند ہے اور اس چھوٹے سے نگینہ کے اندر معانی و حقائق کا وہ پورا شہرستان دکھایا گیا ہے جو قرآن کے تیس پاروں کے اندر پھیلا ہوا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے باطن کی یہی پیاس، جو اس سورہ سے ظاہر ہو رہی ہے، در حقیقت نزولِ قرآن کا سبب بنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے پہلے یہود اور نصاریٰ کو صراطِ مستقیم دکھائی تاکہ وہ خود بھی اس پر چلیں اور دوسروں کو بھی اس پر چلنے کی دعوت دیں لیکن وہ اس راہ پر نہ خود قائم رہے اور نہ دوسروں کے لیے انہوں نے اس کے نشانات باقی رہنے دیے۔ اس راہِ حق کو گم کر کے انہوں نے دنیا کو جاہلیت کے اندھیرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ سورہ اسی اندھیرے سے نکلنے کی دعا ہے اور ایک ایسی دعا ہے جو فطرتِ انسانی کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ یہی دعا ہے جس کی برکت سے دنیا کو قرآن کی روشنی ملی اور جاہلیت کی تاریکی سے نکلنا نصیب ہوا۔ اور یہی دعا ہے جو قرآن کے فہم و تدبر اور اس سے زندگی کے مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کے معاملہ میں بھی ہمارے قدم کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھ سکتی ہے۔ اس پہلو سے بھی یہ سورہ دیباچۂ قرآن بننے کے لیے نہایت موزوں تھی۔

سورہ کا تعلق بعد کی سورہ سے

پورے قرآن سے اس سورہ کا جو تعلق ہے وہ اوپر کی بحث سے اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔ اب ہم اس کا تعلق بعد کی سورہ (سورہ بقرہ) سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔

سورہ فاتحہ کے آخری حصہ اور سورہ بقرہ کی پہلی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سورتوں میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایک دعا اور اس کے جواب یا ایک دعا اور اس کے اثر اور اس کی قبولیت سے ہوتا ہے۔ سورہ فاتحہ کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے:

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ

ہمیں سیدھے رستے کی ہدایت دے، ان لوگوں کے رستہ کی جن پر تونے انعام کیا، جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔

اس کے معاً بعد سورہ بقرہ اس طرح شروع ہوتی ہے:

الم ، ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

الم ، یہ کتابِ الٰہیٰ ہے۔ اس کے کتابِ الٰہیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

گویا سورہ فاتحہ میں میں جس آسمانی ہدایت ورہنمائی کے لیے دعا کی گئی تھی، سورہ بقرہ میں وہ ہدایت سامنے آگئی ہے۔ ایک صاحبِ ذوق جب دعا کے فوراً بعد اس کے اثر اور نتیجہ کو سامنے موجود دیکھتا ہے تو اس کی روح خدا کے شکر کے جذبہ سے سرشار ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور پہلو بھی سامنے رکھنا چاہئیے، وہ یہ کہ سورہ فاتحہ میں منعم علیہم گروہ کے رستہ کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ مغضوب اور گمراہ گروہوں کے طریقوں سے بچائے جانے کی بھی دعا ہے۔ دعا کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر جب آدمی سورہ بقرہ کی تلاوت کرتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس سورہ میں ملتِ ابراہیمی کی تجدید کے ساتھ ساتھ یہود کے ان تمام جرائم کی فہرست بھی بیان ہو گی جو انہوں نے خدا، اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کی شریعت کے خلاف کیے ہیں اور جن کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ٹھہرے کہ خدا کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہو اور وہ قوموں کی امامت کے منصب سے معزول کیے جائیں۔ گویا سورہ فاتحہ میں میں جس انعام یافتہ اور اس کے بالمقابل جس مغضوب گروہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ تھا۔ سورہ بقرہ میں ان دونوں گروہوں سے متعلق پوری تفصیل سامنے آگئی اور واضح ہو گیا کہ کن کی پیروی کرنی ہے اور کن کے طریقوں سے بچنا ہے۔

بالکل یہی صورت سورہ آل عمران کی ہے جو سورہ بقرہ کے بعد ہے۔ بقرہ میں جس طرح یہود کی تفصیل ہے۔ اسی طرح آل عمران میں نصاریٰ کی بدعتوں اور ان کی گمراہیوں کی تردید کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس میں اسلام کی صحیح تصویر بھی پیش کی گئی ہے، جس کی دعوت حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیائے کرام بالخصوص حضرت مسیح ؑ نے دی ہے۔ سورہ فاتحہ کے بعد ترتیبِ قرآن میں انہی دو بڑی سورتوں کا جگہ پانا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہ بعد کی دونوں سورتیں سورہ فاتحہ کی دعا کی مقبولیت اور اس کے آخری حصہ کے اجمالات کی تشریح ہے۔

Our other pages and blogs:

www.facebook.com/Dr.Muhammad.Hamidullah

www.facebook.com/Payam.e.Iqbal

www.ebooksland.blogspot.com

www.sharedhub.blogspot.com

پیام قرآن

The Message of Quran

www.facebook.com/payamequran